ذوالفقار احمد پی ایچ۔ڈی اُردو سکالر
یونیورسٹی آف سرگودھا
ڈاکٹر محمد یار گوندل
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
یونیورسٹی آف سرگودھا

داستانوی تنقید میں رسائل کا حصہ

Journals have historically and literally background in various aspects. Some literary articles have published in literary journals. This article presents the participation of journals in myth criticism. Some Articles are following. The Gul Bakowly, Dastan Hamza, Sabras ka tanqeedi jaiza, Sab Ras par ik nazar, Gulzar Naseem ki Hakyt Murgh-e-Aseer, historical discussion of Gul Bakowli. In this article discussed the different aspects of Myth criticism. The prominent critics described the credible view about numerous myths. Participation of journals is focused in the research paper.

رسالے ہر ملک اور قوم کے ادب میں اہمیت رکھتے ہیں ۔ کیونکہ زیادہ تر ادیبوں کی تخلیقات انھی کے ذریعے قارئین تک پہنچتی ہیں۔ بڑے سے بڑا ادیب انھی رسالوں کے سہارے اپنے آپ کو روشناس کراتا ہے۔ادب میں نئے سے نئے رجحان اور نئی سے نئی تحریکیں رسالوں ہی کے سہارے عام ہوتی ہیں۔اور ان سے اثر قبول کیا جاتا ہے۔

اُردو رسائل دوسرے ملکوں کے رسائل کے مقابلے میں نسبتاً کچھ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ ایک زمانے تک وہ واحد ذریعہ تھے ادیبوں کی تخلیقات کی نشریات کا۔ اُردو میں کتابوں کی نشرواشاعت کا معقول انتظام نہیں تھا۔ نشرواشاعت کی سہولت کے باوجود بہت سے ادیب آج بھی رسائل میں ہی لکھتے ہیں۔اُن کی تخلیقات انھی کے سینوں میں دفن ہو جاتی ہیں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد زمانہ انھیں فراموش کر دیتا ہے۔

اُردو تنقید تو رسالوں کی بڑی مرہون منت ہے۔ اس کی ابتدا صحیح معنوں میں رسائل ہی سے ہوئی۔تہذیب الاخلاق سے اس کا سلسلہ شروع ہوا۔پھر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مخزن، اُردوئے معلی، ادیب اور روزنامہ وغیرہ اس میں حصہ لیتے ہیں۔ان رسائل میں وقتاً فوقتاً خاصے تنقیدی مضامین کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔پہلی جنگ عظیم کے بعد سے تو بہت سے رسالے نکل آئے ہیں۔جنھوں نے دوسرے اصناف ادب کے ساتھ

ساتھ تنقید کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی۔ان رسائل میں اُردو، ہمایوں، ادب، نیرنگ خیال، اورینٹل کالج میگزین، معارف، نگار اورحال کے رسائل میں نیا ادب ، ادبی دنیا، ساقی ، سب رس اور معاصر قابل ذکر ہیں۔

آج کل اُردو میں رسائل کے علاوہ بھی بے شمار رسائل اور اخبارات نکل رہے ہیں۔اوران میں سے تقریباً اس بات کی کوشش ہر ایک کرتا ہے کہ وہ تنقیدی مضامین اور تبصرے ضرور شائع کرے۔لیکن معیاری تنقیدی مضامین اُردو ئے معلی ، مخزن، معارف، زمانہ، نگار، نیا ادب، ادب لطیف،اور ادبی دنیامیں شائع ہورہے ہیں۔

یہ تمام رسالے اُردو تنقید کے انہی عام رجحانات کے علم بردار ہیں۔اکثر رسائل میں انھی تمام نقادوں کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ان میں سے ہر ایک رسالہ اپنے مدرسہ فکر کا خاص خیال رکھتا ہے۔مثلاً اُردو میں عام طور پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں تنقید کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

محمد عبداللہ قریشی کا مضمون ''گل بکاؤلی'' رسالہ نقوش لاہور میں ۱۹۵۸ء میں چھپا۔اردو کے قدیم نثری قصوں اور منظوم افسانوں میں قصہ گل بکاؤلی خاصا مشہور ہے۔جس میں تاج الملوک اور بکاؤلی کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ فارسی زبان میں یہ قصہ پہلے عزت اللہ بنگالی نے ۱۷۲۲ء میں دوست نذر محمد کی فرمائش پر لکھا۔ فارسی قصے کی مقبولیت کے مدنظر جان گلکرسٹ نے نہال چند لاہوری سے اردو نثر میں ڈھالنے کی فرمائش کی۔اس ترجمہ کا نام مذہب عشق رکھا گیا انھوں نے مذہب عشق میں نہایت صحیح با محاورہ اور با قاعدہ زبان استعمال کی ہے۔پہلی مرتبہ یہ قصہ ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر گیان چند کے مطابق اس قصے کے متعدد حصے قدیم داستانوں سے ملتے جلتے ہیں۔مثلاً دلبر بیسوا،شہزادے کو گل بکاؤلی کی مہم سے روکنے کے لیے برہمن اور شیر کی حکایت سناتی ہے۔ یہ پنچ تنتر کے دکنی نسخے میں موجود ہے۔تاج الملوک اپنے بھائیوں کو قید خانہ سے آزاد کراتا ہے لیکن وہ اس سے دھوکہ کرتے ہیں۔یہی الف لیلہ میں شہزادہ خداداد کی کہانی میں ہے۔قصہ گل بکاؤلی میں جو طلسم ہے اس کی مثالیں داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال میں بھری پڑی ہیں۔

مذہبِ عشق کے چھبیس ابواب میں ایک ہی طویل قصہ ہے۔ ہر باب میں اس کا ایک حصہ ہے۔ ہر باب کو داستان کے نام سے تحریر کیا گیا ہے۔ساری کتاب پر فارسیت کا غلبہ ہے۔بعض جگہ ہندی کے الفاظ بھی ہیں۔جب بکاؤلی نیند سے جاگی اوراس نے گلاب کے حوض میں گل کو نہ پایا۔تو اس کے چور کی تلاش میں نکلی۔اندازہ کیجیے کیا نقشہ کشی کی گئی ہے۔

> ''جب بکاؤلی نے جادو بھری آنکھ کھولی اور خواب راحت سے چونکی ،پشواز ناز سے پہنی، کنگھی سے بالوں کو سنوارا۔دوپٹہ اوڑھا،آہستہ آہستہ جھومتی اٹکھیلیوں سے حوض کی طرف چلی۔ ہر ہر قدم پر وہ گل اندام

اپنے نقش قدم سے زمین کو پائیں باغ بناتی تھی..... ناگاہ گل بکاؤلی کی جگہ پر نظر جا پڑی ہر چند بغور و تامل نگاہ کی کچھ اس کا نشان نظر نہ آیا۔''۱

مذکورہ بالا مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زبان اتنی ہموار نہیں ، دو تین سطریں سادہ و صاف ہوتی ہیں۔ پھر فارسی تراکیب سے روانی مجروح ہو جاتی ہے۔ اس مضمون میں عبداللہ قریشی نے قصہ گل بکاؤلی کے تاریخی پہلو عیاں کرتے ہوئے اس کا خلاصہ بھی نقل کیا ہے۔ قصے کے اجزائے ترکیبی کی تقسیم واضح کی ہے۔ اس کے علاوہ قصہ گل بکاؤلی اور قدیم داستانوں کے متعدد حصوں کی مشابہت بیان کی ہے۔ مذہب عشق کے اسلوب اور طرز بیان کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ جس سے مضمون نگار کے شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

راز یزدانی کا مضمون ''میر تقی کی بوستان خیال'' رسالہ نگار میں اگست ۱۹۵۹ء میں چھپا۔ بوستان خیال کا تاریخی نام فرمائش رشیدی اور اس کے اعداد ۱۱۵۵ بتائے گئے۔ مضمون نگار کے پیشِ نظر رضا لائبریری میں موجود مخطوطہ ہے۔ جس کی تفصیل میں جلد نمبر، صفحات کی تعداد، سن تصنیف، سن کتابت اور کیفیت سامنے لائی گئی ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی خیال نے کتاب کو پندرہ جلدوں میں ختم کیا۔

بوستان خیال کے بہت سے تراجم ہوئے لیکن دو تراجم کو شہرت نصیب ہوئی۔ ایک دہلی والوں کی طرف سے اور دوسرا لکھنو والوں کی جانب سے۔ دہلی والوں کے تراجم کی مختصر فہرست دی گئی ہے۔ اس فہرست میں کتاب کا نام، مترجم کا نام، تعداد صفحات، تاریخ طباعت اور مطبع کا نام تحریر کیا گیا ہے۔ پہلی کتاب کا نام حدائق الانظار ہے نو کتب میں سے چھ خواجہ بدرالدین امان دہلوی نے ترجمہ کی ہیں۔ لکھنو والوں کے تراجم کی تفصیل میں نام ترجمہ، نام مترجم، تعداد صفحات، سنہ طباعت اور مقام طباعت درج کیا گیا ہے۔ ان دس تراجم کے دو مترجم (مرزا محمد عسکری اور مرزا محسن علی خان عرف آغا جو) ہیں۔ لکھنو سے ترجمے کا کام ۱۳۲۶ھ تک جاری رہا۔

آگے چل کر مضمون نگار نے ایک امر بوستان خیال کا فارسی میں نہ ہونا کی مختلف دلائل و شواہد سے تحقیق کی ہے۔ راز یزدانی کا خیال ہے رضا لائبریری میں بوستان خیال کے کسی فارسی نسخہ کا نہ ہونا ہی اس یقین کے لیے کافی تھا کہ بوستان خیال فارسی میں طبع نہیں ہوئی۔ علی گڑھ سے عزیزی عابد رضا خان بیدار نے مضمون نگار کو لکھا۔ بوستان خیال کا کوئی مطبوعہ فارسی نسخہ یہاں موجود نہیں ہے۔ بالآخر ستمبر ۵۸ء کے نگار میں نواب حکیم صاحب گوالیاری کا خط بھی شائع ہو گیا۔ انھوں نے لکھ دیا ''یہ خیال صحیح ہے کہ فارسی فسانہ طبع نہیں ہوا''۔ اس طرح متعدد شواہد سے یہ خیال یقین میں بدل گیا۔

اس مضمون میں راز یزدانی نے میر تقی کی بوستان خیال دہلی والوں اور لکھنو والوں کے تراجم کے تناظر میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مزید بوستان خیال کا فارسی میں طبع نہ ہونے کے متعلق دلائل و شواہد اکٹھے کر کے تحریر کیے جس سے مضمون

نگار کے تحقیقی نکتہ نظر کا پتہ چلتا ہے۔

راز یزدانی کا مضمون ''داستان حمزہ'' رسالہ نگار میں ستمبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ مضمون کے آغاز میں مرزا غالب کے خط بنام نواب کلب علی خان بہادر نقل کیا ہے۔

''حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت بعد تسلیم معروض ہے۔ داستان حمزہ قصہ مصنوعی ہے شاہ عباس ثانی کے عہد میں ایران کے ایک صاحب جوں نے اس کو تالیف کیا ہے۔ ہندوستان میں امیر حمزہ کی داستان اسی کو کہتے ہیں اور ایران میں رموز حمزہ اس کا نام ہے۔ دوسو کئی برس اس کی تالیف کو ہوئے اب تک مشہور ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔''۲

مضمون نگار نے لکھا ہے۔ ایران و عراق والی رموز حمزہ کو میں نے دیکھا ہے اس کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ یہ رموز حمزہ سات جلدوں میں تقسیم ہے۔ اور ہر جلد کو کتاب کہا گیا ہے۔ پہلی کتاب ۱۳ جزو کی، دوسری کتاب ۹ جزو کی، تیسری کتاب ۱۲ جزو کی، پانچویں کتاب ۲۱ جزو کی، چھٹی کتاب ۵ جزو کی اور آخری کتاب ۲۵ صفحوں کی۔ یہ رموز حمزہ ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں صدرِ اعظم اور دستور معظم مرزا آقا خان کے ایما سے لکھی گئی۔ رموز حمزہ کا نسخہ دوبارہ لکھوائے جانے کے لیے فیضی کے سپرد ہوا۔ اس نے اسی نسخہ میں اضافہ کر کے اسے سات دفتروں کے بجائے بارہ دفتروں کا بنا دیا۔ عوام میں بھی فیضی کی شہرت ہوگئی۔ نول کشور پریس نے بھی اپنی ہر کتاب کے سرورق پر پروپیگنڈا کیا ہے کہ داستان حمزہ فارسی کا مصنف فیضی ہے۔

عراق اور ایران میں داستان کا رواج کب تھا اور کس نے اس کی بنیاد ڈالی۔ مضمون نگار کے نزدیک اس کا جواب تاریخی شواہد سے دینا ناممکن ہے۔ جب کہ داستان حمزہ کو تاریخی صداقت دینے کے لیے حضرت عبداللہ والد حضرت عباس کے برادر حقیقی کو درمیان میں لایا گیا۔ داستان حمزہ کو حضرت عباس کی روایت کردہ داستان تسلیم کرنا قطعی ناممکن ہے۔ حضرت عباس کا دامن داستان سے بالکل پاک ہے۔

خلیل علی خان اشک نے داستان کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بنیاد اس قصہ کی سلطان محمود شاہ کے وقت سے ہے۔ محمود شاہ سے مراد محمود غزنوی نہیں لیا جا سکتا۔

اردو میں داستان امیر حمزہ چار جلدوں میں دو مترجموں مولوی عبداللہ بلگرامی اور مترجم خلیل علی خان اشک کی طرف سے نول کشور پریس کی طرف سے ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس میں صرف حمزہ صاحب قران کی پہلوانی کا ذکر، نہ کسی طلسم کا ذکر ہے۔ بہتر تہتر داستانوں پر چاروں جلدیں مکمل ہوتی ہیں۔ مضمون نگار کا خیال ہے یہی داستان حمزہ کی ابتدائی صورت ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ داستان حمزہ نامہ اور داستان حمزہ کے ناموں سے دنیا کی مختلف لائبریروں

میں پائی جاتی ہے۔اس کے نسخوں کے متعدد مرتب کرنے والے ہوں ۔اسی سبب ہر نسخہ میں اختلاف لفظی موجود ہے۔ لیکن یہی داستان سب سے قدیم ہے۔

اس مضمون میں داستان حمزہ کے متعلق سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔جس میں ایران ،اعراق والی رموزِ حمزہ کی تفصیل دی گئی ہے۔ایران وعراق سے ہندوستان میں اس کے آنے کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔اس کے علاوہ تاریخی ہیئتوں کو اس سے کس قدر علاقہ ہے اور اس میں ان کی موجودگی کس حد تک حقیقت ہے یہ امر بھی تحقیق طلب ہے۔اس پر مضمون نگار نے شواہد سے بات کی ہے۔

مضمون ''مطبوعہ طلسم ہوشربا'' از راز یزدانی نگار ستمبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔مضمون نگار کا خیال ہے کہ طلسم ہوشربا سب سے پہلی داستان ہے۔ جو کسی دوسری زبان سے ترجمہ ہو کر نہیں آئی۔اس کے بعد قمر لکھنوی نے جتنے طلسم لکھے۔ مثلاً طلسم فتنہ نور افشاں ،طلسم ہفت پیکر ،طلسم خیال سکندری اور قمر لکھنوی اور شیخ تصدق حسین کا لکھا ہوا طلسم زعفران زاد سلیمانی یہ سب اردو ادب کی اپنی داستانیں ہیں۔طلسم ہوشربا کے اولین مصنف میر احمد علی تھے۔نوشیرواں نامہ سے صدلی نامہ تک نول کشور میں تراجم شائع ہوئے۔رام پور میں داستان کے فارسی مخطوطات کا جو کام ہوا ہے۔اس کام میں زیادہ میر قاسم علی اور میر احمد علی کا ہاتھ ہے۔میر احمد علی، میر قاسم علی اور میر نواب دربار رام پور سے متوسل ہونے کے سبب رموز حمزہ کے بعد داستان کو آگے بڑھانے کا خیال دربار رام پور میں پیدا ہوا۔داستان حمزہ کو رموز حمزہ کے بعد جو بڑھایا گیا ہے۔وہ ملک کے داستان کہنے والوں کا اپنا مال ہے۔مضمون نگار کا خیال ہے:

> ''رام پور لائبریری کے قلمی ذخیرے میں تلاش کرنے سے مجھے یقین ہو گیا کہ میر احمد علی کی بیان کردہ طلسم ہوش ربا کا ملنا آسان نہیں ہے۔البتہ اس کا اسلوب ضرور معلوم ہو گیا اور وہ یہ ہے کہ منشی غلام رضا ابن منشی انبہ پرشاد نے طلسم ہوشربا کے نام سے دو سلسلے لکھے تھے۔ایک طلسم ہوشربائے باطن کے نام سے چار جلدوں میں اور دوسرا طلسم باطن ہوشربا کے نام سے دس جلدوں میں۔طلسم باطن ہوشربا کی پہلی جلد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آشیاں نواب کلب علی خان بہادر کے بعد وہ لکھتے ہیں ۔اس کے اصل مصنف میر احمد علی تھے۔میر احمد علی سے وہ طلسم منشی انبہ پرشاد رسا کو پہنچا۔ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منشی غلام رضا نے ان ۱۳۲۶ صفحات میں جو کچھ لکھا ہے وہ وہی طلسم ہوشربا ہو سکتا ہے جسے میر احمد علی کی تصنیف کہا تھا۔''۳

طلسم ہوشربائے باطن اور طلسم باطن ہوشربا کی تفصیل میں نام جلد ،تعداد صفحات ،سنِ تصنیف ،سنِ کتابت اور نام مصنف منشی غلام رضا ابن انبہ پرشاد رسا لکھا ہے۔اس کے علاوہ مرزا علیم الدین رام پوری کی طلسم ہوشربا کے ۹ سلسلے ہیں جو ۱۸۸۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۵ء تک مکمل ہوئے۔

اس مضمون میں راز یزدانی نے طلسم ہوشربا کے متعلق مباحث قلم بند کیے ہیں۔طلسم ہوشربائے باطن اور طلسم باطن ہوشربا کی فہرست دی گئی۔مزید علیم الدین رام پوری کی طلسم ہوشربا کی جزئیاتی تفصیل دی گئی ہے۔

بذل حق محمود کا مضمون ''مقبول احمد کا قصہ ہیر و رانجھا'' صحیفہ جنوری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔مغربی پاکستان کی اس عشقیہ داستان کو پنجابی شاعروں اور عارفوں نے مقبولیت تک پہنچایا۔ ہیر رانجھا کے موضوع پر فارسی قصوں اور مثنویوں کی دریافت کے بعد اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ داستان اکبر ہی کے عہد میں وادی چناب و مہران سے گزر کر وادی گنگ و جمن تک جا پہنچی تھی۔سعید جامی نے یہ قصہ فارسی میں نظم کیا۔اور مثنوی کا نام افسانہ دل پذیر ہے۔اس کے بعد میر قمر الدین عفت دہلوی کا قصہ ''عشق ہیر و رانجھا'' فارسی نظم میں ہے۔اس موضوع پر سب سے قدیم اردو قصہ جس کا ذکر تذکروں میں ہے۔کھیم نرائن رند کا لکھا ہوا ہے۔انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں ہیر رانجھے کے قصے کا ایک اور قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔اس موضوع پر اردو کی سب سے پہلی مثنوی ''آبلہ حرارت عشق'' ہے۔ جو کانپور سے ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔مقبول احمد کا قصہ ہیر رانجھا تین مرتبہ بالترتیب ۱۸۴۸ء،۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۸ء میں چھپا۔گارساں دتاسی کے خطبے اور مثنوی نیرنگ عشق کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن میں مقبول احمد کا ذکر ملتا ہے۔مقبول احمد نے اپنے قصے کے متعلق کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

> ''افسانہ ہیر و رانجھے کا سرزمین ہند میں عجب ،دل چسپ ،تمکین و رنگین ،طرفہ صداقت آئین اور خلوص آگین واقع ہوا ہے.....خیال نظم فارسی نے دل میں جا کی کچھ اشعار لکھے، پھر دھیان آیا کہ فی زمانہ رواج اردو کا بیش تر ہے۔اور نظم سے نثر میں وسعت ،اثر ،حاصلِ مقصد خلاصہ مطلب حشو و زواید مقفیٰ و مسجع بطرز نو طرز مرصع بہ خاطر احباب مخلص تحریر کیا۔''۴

مقبول احمد نے ہیر کا سراپا ،دریائے چناب کی طغیانی اور بیان کو رومی اور حافظ کے کلام سے آراستہ کیا ہے۔ قصے میں مقامی رنگ بھی جھلکتا ہے۔اس کے اسلوب بیان کی جھلک دیکھیے۔'' حاضر شہرہ جہاں ،شہر تخت ہزاراں..... خاک وہاں کی حسن خیز ہو،عشق انگیز'' ان جملوں میں زبان و بیان کے اظہار کے کمال کے ساتھ ساتھ عشق کی حقیقت بھی بیان ہوئی ہے۔مقبول احمد نے داستان کو تصوف کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ ہیر کا سراپا بڑے دل نشین انداز میں بیان کیا ہے۔''وہ تیرے انتظار میں نرگس وار نگران اور سنبل وار پریشاں ہے۔'' یہ جملہ مقبول احمد کی وسعت علمی کی گواہی دیتا ہے۔اس مضمون میں قصہ ہیر رانجھا کی شہرت اور دیگر زبانوں میں اس کے تراجم کا ذکر کیا ہے۔اس قصہ کے اسلوب بیان کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔یہ مضمون ہیر رانجھا کے حوالے سے معلومات افزا ہے۔

ڈاکٹر محمد عقیل کا مضمون ''مثنوی میں فوق فطری عناصر'' رسالہ نقوش ادارہ فروغ اردو لاہور سے نومبر ۱۹۶۴ء میں چھپا۔مضمون کے آغاز میں متشکل فوق فطری ہستیوں کی تفہیم دی گئی ہے۔فوق فطری عناصر کی چھ حسب ذیل قسمیں

ہیں۔اجتہ اوران کا قبیل، پریوں کا خیل، فرشتے، براق اور دیوتا، دیواور دیونیاں، بھوت، ڈائن، چڑیل، بھتنی، راکشس، راکشنی وغیرہ ان متشکل فوق فطری عناصر کی شکل و شباہت اور خدو خال کے علاوہ ان کی رہائش اور کارناموں کو بھی اختصار سے بیان کیا ہے۔مثنویوں میں ان تمام فوق فطری اجزا کو تلاش کر کے ان سے بحث کی گئی ہے۔مضمون نگار نے پہلے میر کی مثنویوں میں فوق فطری عناصر کی تلاش کا تذکرہ کیا ہے۔میر کی صرف عشقیہ مثنویوں میں فوق فطری عناصر کا دخل ہے۔مثنوی شعلہ عشق میں پراسرام کی بیوی جب دھوکے میں آ کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔تو اس کی بے قرار روح دریا کے کنارے پراسرام کی تلاش میں مارے مارے پھرتی ہے۔ماہی گیر صرف اسے شعلے کی شکل میں دیکھتا ہے۔ یہ شعلہ پراسرام نامی شخص کو پکارتا آتا ہے۔

کہے ہے پراسرام تو ہے کہاں

مثنوی سحر البیان میں بھی فوق فطری عناصر سے سابقہ پڑتا ہے۔قصہ کی ابتدا میں ہیروئن اپنا تخت اڑاتے ہوئے خوبرو نوجوان کو خلوت میں پلنگ پر آرام فرماتے دیکھتی ہے۔ یہ پری اس انسان پر عاشق ہو کر اسے پرستان میں اڑا لے جاتی ہے۔اس پرستان کی ہر چیز انوکھی ہے۔میر حسن اس کے عجائب وغرائب کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں:

پری جو اُڑی واں سے لے کر اُسے
اتارا پرستاں کے اندر اُسے
وہاں ایک تھا سیر کا اس کی باغ
کہ جس کے گلوں سے ہو تازہ دماغ
طلسمات کے سارے دیوار و در
نہ یاں کے سے کوٹھے نہ یاں کے سے گھر ۵

اردو کی دیگر مثنویوں سے زیادہ گلزار نسیم میں فوق فطری عناصر کا عمل دخل ہے۔ساری مثنوی میں پریاں اڑتی اور رقص کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ پریاں اپنی شکل بدلتی ہیں۔مضمون نگار کا اس مثنوی کے متعلق خیال ہے۔اس عنصر کی اس مثنوی میں اتنی بہتات ہے۔اگر یہ ڈراما ہوتا تو بلا شبہ اسے اردو کا Mid Summer Nights Dream کہا جاتا۔ اس مثنوی میں پریوں کے آتشی ہونے پر متعدد جگہ روشنی پڑتی ہے۔انسان اور پری ایک طرح کی ضد ہے۔اسی سبب ایک کی تخلیق آگ سے اور دوسرے کی خاک سے۔اکثر مقامات پر دو گروہ ایسی گفتگو میں کبھی پری کی نسل کو بلند ثابت کرتے اور کبھی انسان کو عظیم بناتے ہیں جمیلہ کی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

ہر چند کہ انس و جاں میں ہے لاگ

دب جاتی ہے مشتِ خاک سے آگ

پریوں کے باغ کا ذکر کئی مقامات پر ملتا ہے لیکن اس کا اچھا نقشہ بکاؤلی کے باغ میں ملتا ہے۔ بکاؤلی کا باغ جادو کا باغ ہونے کے سبب ہر خواص و عام کا وہاں گزر نہیں۔ اس مثنوی میں دیوؤں کے قوی ہیکل جسامت کے ساتھ موجود ہے۔ راستہ چلتے ہوئے لوگوں کو پریشاں کرنا۔ پریوں کو پکڑ کر وصل کا طالب ہونا اور مزید دیوؤں کی حرکات سامنے لائی گئی۔

مثنوی سام نامہ از فیض اللہ خاکؔ میں فوق فطری عناصر کی اتنی فراوانی ہے۔ اتنی اردو کی کسی داستان میں نہیں ملتی ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں خاکؔ نے یہ داستان اردو میں نظم کر کے اردو میں شاہنامہ جیسی کوئی چیز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مثنوی ۱۸۶۷ء میں تحریر کی گئی ہے۔ یہ مثنوی مکمل فوق فطری عناصر سے مزین ہونے کے سبب مافوق فطری عناصر کی فہرست میں شامل کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں سام کی کئی جنگوں کا تذکرہ ہے۔ جس میں میں وہ نہنگاں، دیوارقم، مہابت دیو اور ابر ہا دیو سے لڑتا ہے۔ یہ جنگیں خاصی دلچسپ ہیں۔ ایک جنگ میں نہنگاں دریا سے برآمد ہوتا ہے۔ تو پانی میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ نہنگ دریائی اور مچھلیاں بے قرار ہو کر دریا سے نکلتی ہیں تو سام سمجھتا ہے کہ شام ہو رہی ہے۔ مثلاً

نہنگوں نے جانا کہ آیا وبال

اس مضمون میں مشہور زمانہ مثنویوں اور دیگر مثنویوں سے فوق فطری عناصر نمایاں کیے گئے ہیں۔ مضمون نگار نے بڑی جستجو اور تندہی سے اس عنصر کو واضح کر کے مضمون کو دلچسپ اور جامع بنا دیا ہے۔ یہ مضمون اپنی نوع کے لحاظ سے جدت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ''رزمیہ بحر اور سحر البیان'' رسالہ نگار پاکستان میں ۱۹۶۵ء میں چھپا۔ اردو کی مثنویوں میں جو قبول عام ''سحر البیان'' کو نصیب ہوا۔ کسی دوسری مثنوی کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملا۔ یہ مثنوی بحر متقارب مثمن مقصور و مخذوف یعنی فعولن فعولن فعولن یا فعل کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ انشا مولانا عبدالسلام ندوی و رام بابو سکسینہ سے محمود فاروقی تک سب نے بحر کے انتخاب کے ضمن میں اسے میر حسن کی جدت اور اختراع قرار دیا ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں ان لوگوں نے تحقیق نہیں کی۔ حالانکہ سحر البیان سے بہت پہلے اردو میں کئی عشقیہ مثنویاں بحر متقارب مثمن میں نظم ہو کر مقبولیت کا درجہ پا چکی تھیں۔ سراج اورنگ آبادی کی معروف مثنوی ''بوستان خیال'' سے میر حسن کو واقفیت ہو گی۔ بوستان خیال اور سحر البیان کے تقابل سے گمان ہوتا ہے۔ جیسے میر حسن نے اپنی مثنوی کا طرز درحقیقت بوستان خیال سے اڑایا ہے۔ بحر و وزن کے علاوہ انداز بیان میں بھی متعدد مقامات پر مماثلت ہے۔ دونوں مذکورہ بالا مثنویوں کا تقابل یوں کیا گیا ہے۔ سراج نے اپنی مثنوی میں باغ کی تصویر اس طور پر اتاری ہے۔

ہر ایک سمت پانی کی نہروں کی سیر
وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
رواں آب کے ہر طرف آبشار
جدھر دیکھیے ہو رہی تھی بہار

میر حسن کے باغ و بہار کا نقشہ دیکھیے۔

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان
لگے جیسے زربفت کے سائبان

''سراج اور میر حسن کی لفظی تصویروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے..... نامکمل عشقیہ مثنویوں کے جو اجزاء قدیم تذکروں میں ملتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن کے سامنے عشقیہ مثنویوں میں رزمیہ بحر کے استعمال کے نمونے موجود تھے۔''۶

عشقیہ مثنویوں میں فضائل علی خان بے قید کی مثنوی قابلِ ذکر ہے۔ یہ ایسی مثنوی ہے۔ جس سے مثنوی نگاروں نے ضرور کسی طور پر استفادہ کیا ہے۔ خود میر حسن بھی اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ ''حسب حال خود مثنوی گفتہ و در ہائے معنی سفتہ'' مختلف تذکروں میں اس مثنوی کے پچھتر اشعار محفوظ ہیں۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس مثنوی سے لوگوں کو چراغ سے چراغ جلانے میں معاونت ملی ہوگی۔ ایک اور مثنوی ''در تعریف شہزادہ'' کا تذکرۃ الشعرا میں ذکر ہے۔ شاید میر حسن نے اس مثنوی سے تاثر لیا ہو۔ فرمان فتح پوری نے سراج کی مثنوی بوستان خیال کا سحر البیان سے تقابل کر کے انشا اور دیگر مورخین و ناقدین کے جدت بیان کی تردید کی ہے۔ مزید برآں ایک مثنوی ''در تعریف شہزادہ'' کے اشعار نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ میر حسن نے ضرور بوستان خیال کے علاوہ مذکورہ بالا مثنوی سے بھی استفادہ کیا ہے۔

نسیم اختر پالوی کا مضمون ''مثنوی قطب مشتری اور ملا وجہی کی کردار نگاری'' نگار پاکستان جون ۱۹۶۵ء میں چھپا۔ افسانوی ادب میں حسن سازی کے لیے زندہ کرداروں کا فطری اصولوں کے تحت ہونا ضروری ہے۔ فطری اصولوں کی اس روش کو جو فن کار جتنا موزوں انداز سے نبھا سکے۔ وہ اتنا ہی بہتر کردار نگاری کا حسن پیش کر سکتا ہے۔ قطب مشتری درحقیقت قطب شاہ اور بھاگ متی کے رومان انگیز تعلقات کی منظوم داستان ہے۔ صنعتی کی مثنوی ''قصہ بے نظیر'' کی

کردار نگاری پر وجہی کی قطب مشتری کو برتری حاصل ہے۔ اس مثنوی کا با ضابطہ کردار ابراہیم قطب شاہ کا کردار ہے۔مثنوی کے آغاز سے اختتام تک نمودار رہنے والے کردار میں دور اندیشی، پختہ کاری اور ہوش مندی شامل ہیں اس میں وہ فنی روح مفقود ہے جو اسے لازوال کردار بنا سکے۔نسیم کے ''یورپ کے شہنشاہ'' کے کردار کی استقامت اور میر حسن کے ''کسی ملک میں تھا کوئی بادشاہ'' جیسی استواری ناپید ہے۔مضمون نگار قطب مشتری کے ہیرو کو دیگر داستانوں کے ہیروز سے بہتر گردانتے ہیں۔فسانہ عجائب کا ہیرو، مثنوی گلزار نسیم کا ہیرو، سحر البیان کا ہیرو سب کے سب اپنی ہوس کی آگ کئی کا فراداؤں سے بجھاتے ہیں مگر قطب مشتری کا یہ امتیاز ہے کہ اس کا ہیرو ایک زلف کا گرفتار اور ایک ہی بت کا پرستار ہے۔مضمون نگار نے قطب شاہ کی خوبیوں کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

> ''قطب شاہ کے کردار میں خلوص، تعشق، جذبات کی وارفتگی، شجاعت، حمیت اور غیرت کے نمونے ملتے ہیں۔تصور جاناں میں اس کا اضطراب دراصل اس کے دلی جذبات کی صداقت کو ظاہر کرتا ہے۔اس کے ارادے میں بڑی پختگی اور استقامت ہے۔راہ کی دشواریاں اس کے ارادے کو متزلزل نہیں کرتیں۔اس میں مہم سازی کا جذبہ بھی ہے۔وہ اژدھے اور راکھشس کا مقابلہ کرتا ہے۔اس میں اخلاقی قوتیں بھی ہیں.....مولوی عبدالحق کا قول صادق ہے کہ گویا مثنوی اعلیٰ پایہ کی نہ ہوتا ہم اس میں بعض باتیں بڑی خوبی کی ہیں۔انھیں بعض خوبی کی باتوں میں کہیں کہیں کردار نگاری کی اچھی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔''۷

قطب مشتری کے کرداروں میں نام کا التزام بھی اہمیت کا حامل ہے۔نذیر احمد کے ناولوں کی طرح قطب مشتری میں بھی کرداروں کے نام میں تکلف پایا جاتا ہے۔مثنوی کے تمام کرداروں کے نام سیاروں کے نام پر ہیں۔مثلاً قطب مشتری، زہرہ، عطارد، مہتاب، مریخ سارے کرداروں کے نام سیاروں کے نام سے موسوم ہیں۔اسی سبب سے وجہی کو علم نجوم کا ماہر خیال کیا جاتا ہے۔

مضمون نگار کے نزدیک عطارد شاید اُردو مثنویوں میں اپنے طرز کا ایسا کردار ہے۔جو شہزادے کا مددگار ہو کر بھی اس کا بہترین ناقد ہے۔عطارد کا کردار ہیرو کے شانہ بشانہ چلتا ہے۔سحر البیان کی نجم النساء کی طرح قطب مشتری کا عطارد بھی آخر میں ہیرو کی معاونت اکیلا کرتا ہے اور قلیل وقت کے لیے ہیرو کی شخصیت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

مثنوی کی ہیروئن مشتری ایک شہزادی ہے جس کے حسن کے چرچے ہیں۔ جہاں گشت عطارد نے بھی اس سے زیادہ خوبرو دوشیزہ نہیں دیکھی۔محبت اور تصوراتی دنیا کا عشق قطب مشتری کا طرہ امتیاز ہے۔مضمون نگار کے نزدیک سحر البیان کی بدر منیر، گلزار نسیم کی گل بکاؤلی اور وجہی کی مشتری میں زیادہ فرق نہیں۔قطب مشتری کے ذیلی کرداروں میں اتنی

طاقت نہیں۔ یہ مددگار کردار واقعہ کو چند قدم آگے بڑھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ ملکہ، مہتاب، زہرہ اور مریخ خان وغیرہ سب کے سب اپنا نقش نہیں بٹھا سکتے۔ ملا وجہی میں کردار نگاری کی اوسط صلاحیت ہونے کے باوجود اس نے فن میں کردار نگاری کا جو آرٹ پیش کیا ہے۔ وہ غنیمت ہے اس مثنوی کی اسی سبب تاریخی اہمیت قائم رہے گی۔

اس مضمون میں مثنوی قطب مشتری کے اہم فردی کرداروں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اہم کردار قطب شاہ، عطارد اور مشتری قرار دیے گئے ہے۔ ان کرداروں کی انفرادیت واضح کی گئی ہے۔ مشتری کے کردار کو سحر البیان کی بدر منیر اور گلزار نسیم کی گل بکاؤلی کے ہم پلہ ٹھہرایا گیا ہے۔

مضمون ''سب رس کا تنقیدی جائزہ'' از امجد کندیانی رسالہ ''اردو نامہ'' میں ۱۹۶۶ء میں چھپا۔ آغاز میں اردو کی بلند پایہ تمثیل سب رس کے بابت اظہار تاسف کیا گیا کہ نہ سنجیدگی سے سب رس کا تنقیدی جائزہ لیا گیا اور نہ اس کی حقیقی فنی عظمت کو روشنی میں لایا گیا ہے۔ اس کا سبب زبان کی قدامت بتائی گئی ہے۔

سب رس کی نمایاں خوبی اس کا خوب صورت اور زندہ وشگفتہ اسلوب بیان ہے۔ سب رس پڑھتے ہوئے وجہی کے اسلوب میں تروتازگی کا احساس ہوتا ہے۔ خشک فلسفیانہ مباحث کا ذکر ہونے کے باوجود وجہی نے حسن بیان سے اسلوب کو دل کش بنا دیا ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ وجہی نے ایسی زبان استعمال کی ہے۔ جس کا مزاج بے تکلف اور افسانوی ہے۔ روزمرہ کی گفتگو کا سا آہنگ پیدا کیا ہے۔ ہمت اور نظر کی ملاقات ملاحظہ کیجیے۔ ''ہمت نظر کوں بہوت کسیا، پیٹ پکڑ پکڑ ھنسیا۔''

وجہی کے ہاں جاندار مکالمے عورتوں کی زبانی ہیں۔ مکالموں کی برجستگی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ وجہی کے بات کرنے کی رفتار بڑی تیز ہے۔ لہجہ کہیں کہیں حسبِ موقع دھیما بھی ہے اور تیز بھی۔ کہیں جوش بھی دکھائی دیتا ہے۔ حیرت، استعجاب اور مسرت کے مخصوص لہجے بھی ہیں۔ مکالمے کے لہجے میں خوش آمدید کہنے کا والہانہ انداز قابلِ دید ہے۔ قامت نے کہا اے واللہ، بسم اللہ، بصحت وسلامت، خدا تجھے تیری مرادکوں انپڑاوے۔ کہیں لہجے میں افسردگی کا رنگ ہے۔ مثلاً وے وصال کے خنجر کا زخم سوسنا بہوت مشکل۔ مذکورہ جملوں میں لہجے کا تنوع وجہی کے فنی شعور کا گواہ ہے۔ دوسری طرف یہ وجہی کی قدرت جذبات نگاری کا نتیجہ ہے۔ اس قدیم داستان کے فن کے متعلق امجد کندیانی کا خیال ہے۔

> ''یہ قصہ ساخت کے اعتبار سے تو سادہ ہے۔ اور ایک ہی پلاٹ رکھتا ہے۔ جس میں کہانی سے کہانی کا سلسلہ یا کوئی اور پیچیدگی نہیں ہے لیکن مزاج کے اعتبار سے کافی حد تک داستان سے متاثر ہے۔ اول تو کرداروں کا غیر معمولی اوصاف کا حامل ہونا۔ خضر پیغمبر کی مدد اور دوسرے مافوق الفطرت عناصر سب رس کے مزاج کو داستانوں سے بہت قریب کر دیتے ہیں.....تمہیدی حصہ کچھ مثنویات کے تمہیدی حصوں میں ملتا جلتا

ہے۔ قصے میں زندگی، تصوف، سماج، داستانی پراسراریت، وجہی کی تبلیغ، آداب سلطنت غرض کتنے ہی موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ قصے کی بنیاد اس حدیث پر ہے کہ ''المجاز قنطرۃ الحقیقت'' مجاز حقیقت کی سیڑھی ہے۔ اس لیے مصنف ہر جگہ مجاز اور حقیقت دونوں کا دامن تھامے رکھتا ہے۔''۸

سب رس کا رجحان بہ نسبت فلسفیانہ بحثوں عملی زندگی اور شریعت کے امور کی طرف زیادہ ہے۔ تصوف کے صرف چند اسرار و رموز کی پردہ کشائی کی گئی۔ تصوف کی مندرجہ ذیل اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ مثلاً ذکر، شغل، حال، مقام، خطرہ، فلسفہ جبر اور المجاز قنطرۃ، الحقیقت وغیرہ۔ اس مضمون میں سب رس کا بلحاظ فن تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ سب رس کی سب سے نمایاں خوبی شگفتہ اسلوب بیان کو بھی مثالوں سے نمایاں کیا گیا ہے۔ آخر میں سب رس کے فنی مرتبہ کا بھی تعین کیا گیا ہے۔ سب رس کا پایہ فنی اعتبار سے زیادہ بلند ہے۔ اتنا طویل اور پیچیدہ قصہ ہونے کے باوجود مجاز و حقیقت کا دامن کہیں نہیں چھوٹتا۔

سید جاوید اختر کا مضمون ''سب رس پر ایک نظر'' رسالہ قومی زبان کراچی سے جون ۱۹۶۷ء میں چھپا۔ آغاز میں سب رس کو ابتدائی نثر یہ شہ کار ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ آج سے چند برس پہلے فضلی کی کربل کتھا کو اردو نثر کی اولین کتاب مانا جاتا ہے۔ نئی تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ فضلی سے قبل بھی اردو نثر میں متعدد کتب تصنیف ہوئیں۔ انھیں ابتدائی نثر کے شہ کاروں میں سب رس شامل ہے۔ ملا وجہی نے سب رس عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر تحریر کی۔ وجہی کا یہ سب سے قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں:

> ''سب رس ملا وجہی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ محمد قلی کے کلیات کی طرح یہ بھی قدیم اردو کی ایک بہت ہی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اگرچہ یہ اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ مگر وجہی کے دست و قلم نے اس میں وہ جو ہر پیدا کر دیے ہیں کہ یہ خرد سال دوسری زبانوں کی کہنہ سال معیاری کتابوں سے برابری کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس تالیف کو اردو زبان کے ساتھ وہی نسبت ہے۔ جو ''مقامات بدیعی'' کو عربی کے ساتھ اور ''مقامات حمیدی'' کو فارسی کے ساتھ ہے۔''۹

ملا وجہی کو جس دور میں جینا نصیب ہوا۔ اس زمانے میں برصغیر میں فارسی کا چرچا تھا۔ اس عالم میں وجہی کی بڑی جرأت تھی کہ اس نے اپنی ادبی تخلیق کے لیے اردو کا انتخاب کیا اور وہ بھی زیادہ تر نثر میں۔ جس میں نہ کوئی اس کا رہبر تھا اور نہ ہی مقلد۔ وجہی کو بذات خود اس جدت طرازی کا مکمل شعور تھا۔ یقیناً اس لیے اس نے قصے کی ابتدا کرتے وقت ''آغاز داستان۔ زبان ہندوستان'' کی سُرخی قائم کی ہے۔ سب رس ایک تمثیل ہے۔ سنسکرت میں ہت اپدیش فارسی میں ''انوار سہیلی'' عربی میں ''اخوان الصفا'' اور انگریزی میں Pilgrim's Progress اس نوع کی معروف نگارشات ہیں

سب رس کی کل اہمیت اس کے اسلوب کے سبب ہے۔ سب رس کا اسلوب اردو بان میں اس کی ایجاد ہے۔ تو بے شک صحیح ہے۔ سب رس کے اسلوب کے جو خصائص وجہی نے بتائے ہیں۔ ان میں اہم ترین بات نثر میں شعریت کا رنگ ہے۔ ''نظم ہور نثر ملا کر، گلا کر'' بیان کا ایسا انداز وضع کیا ہے۔ سب رس لسانی اعتبار سے خاص طور پر بیان کی عمارت گری کے لحاظ سے مواد کی مدد سے تعمیر کی ہوئی عبارت کا اولین نمونہ ہے۔ اس میں زبان کے ساتھ بیان کا بھی ہندوستان گیر تصور موجود ہے۔

اس مضمون میں سب رس کی قدامت اور اس کا مقام و مرتبہ واضح کیا گیا ہے۔ اس کے اسلوب اور زبان و بیان پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اسلوب کے نمونے حسب ضرورت سامنے لائے گئے ہیں۔ یہ مضمون تنقیدی اعتبار سے اہم ہے۔

غیور عالم کا مضمون ''سب رس اور اسلوب بیان'' قومی زبان کراچی میں دسمبر ۱۹۶۷ء میں چھپا۔ مضمون کی ابتدا میں واضح کیا کہ اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا کام دکن میں شروع ہوا۔ اردو زبان کی تاریخ بزرگوں کی تصانیف کے تذکرہ کے بغیر شروع نہیں کی جاسکتی۔ جن میں ہدایت نامہ، معراج العاشقین اور سہ بارہ قابلِ ذکر ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ملا وجہی کی سب رس دکنی زبان کی پہلی ادبی کتاب ہے۔ سب رس دکنی زبان میں ادبی تخلیق کا ترجمہ ہے جس طرح باغ و بہار کو میر امن کا قطعی تخلیقی کارنامہ نہیں کہہ سکتے۔ بالکل اسی طرح سب رس بھی وجہی سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ سب رس میں بیان کیا گیا قصہ دلچسپ نہیں۔ ایک الجھا ہوا قصہ ایک الجھا ہوا ماحول ہے لیکن پروفیسر شیرانی کی رائے ہے۔

> ''ایک ادبی تصنیف میں اس قسم کا نقص چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔ ایسی تصانیف کا مقصد درحقیقت افسانہ نگاری نہیں ہوتا بلکہ افسانے کے پیرائے میں اخلاقی سبق اور درسِ حیات دینا ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ متین خیالات کو ایک دل فریب پیرائے میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی کتابوں میں اخلاقی پہلو ہر بہانے سے نمایاں کیا جاتا ہے۔ اور طبیعت کا تمام زور اسی پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ نظامی، خسرو اور جامی کی مثنویات کا یہی ڈھنگ ہے۔ اور اس نقطہ نظر سے سب رس ان کی قریبی مقلد ہے۔''[۱۰]

وجہی کو اسلوب کی جدت طرازی کا شدت سے احساس ہے۔ کتاب میں وہ اکثر مقامات پر اپنی اس اہمیت کو دہراتا ہے۔ مثلاً ''یو بات نہیں یو تمام وحی ہے الہام ہے'' زبان اور اسلوب کے اعتبار سے یہ اردو کا پہلا کامیاب نقش ہے۔ ''قصہ پن'' سب رس میں کمزور ہے۔ پر تکلف مقفیٰ اور مسجع عبارت کے نمونے فارسی میں کافی ملتے ہیں۔ اُردو میں مرصع، مسجع اور مقفیٰ نثر فارسی کے اثرات سے وجود میں آئی۔ یہی اثر سب رس میں نمایاں نظر آتا ہے۔ سب رس میں قافیہ بندی کے باوجود ملا وجہی کی عبارت میں کوئی جھول نہیں ہے۔ حسب مدعا وہ یکساں ہموار نثر میں بڑی صفائی کے

ساتھ مطلوبہ بات کہتا ہے۔اس کے نثری کارنامے کے سبب اس کے فن کا احترام کرنا پڑتا ہے۔

اس مضمون میں سب رس کے ماخذ ''دستور عشاق'' ثابت کرتے ہوئے وجہی کے اپنے دعویٰ نثر کے متعلق تحریر کیا۔وجہی کی نثر اور اسلوب کے بابت ناقدین کی آرا شامل کر کے مضمون نگار نے اپنے مضمون کو باوزن اور معتبر بنایا ہے۔

سید معین الرحمٰن کا مضمون ''اردو کی نثری داستانوں میں کردار نگاری باغ و بہار تک'' رسالہ فنون لاہور سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔اس مضمون میں کردار نگاری کا آغاز سب رس کے کرداروں سے کیا گیا۔اس نیم طبع زاد عشقیہ تمثیل کے سب کردار تخیلی و تصوراتی ہیں۔مثلاً اس میں ایک کردار ہمت ہے۔اسی طرح غمزہ اور قامت وغیرہ کے بھی کردار ہیں۔ ہیرو دل کا تعارف یوں کروایا گیا ہے۔اس کا جوڑ دنیا میں کہیں نہ تھا۔ واصل کامل عاشق عاقل ،عالم عامل۔ ملا وجہی اپنے محبوب کردار کو خیر اور معتوب کردار کو مجسم برائی بنا کر پیش کرتے ہیں۔حسن وجہی کا محبوب اور قصے کا مرکزی نسوانی کردار ہے۔ وجہی اس کا سراپا اور روپ یوں اجاگر کرتے ہیں۔''بہت مقبول ،بہت خوش اصول ،بہت معقول ،بہت خوش رنگ، بہت خوش ڈھنگ۔وجہی اپنے محبوب کردار میں مقدور بھر خوبیاں جمع کرنے میں ماہر ہیں۔وہ ہر لمحہ اس فکر میں مگن رہتے ہیں کہ کردار کے بارے میں کسی نئی صفت کا اعلان کیا جائے۔جب حسن کی صفات کے طویل اعلان نامے کے باوجود یہ محسوس کرتے ہیں کہ جیسا چاہیے حق ادا نہیں ہو رہا تو پکار اٹھتے ہیں کہ آخر''کتے بولوں اس کے گن'' وجہی کی کردار نگاری میں جانب داری کا پہلو ہے۔اسی سبب ان کے کردار یک رُخے ہیں۔

طوطی نامہ کے کردار تمثیلی نہیں۔اس کے چار کردار بڑھئی ، سنار اور درزی ہیں۔ یہ سب کے سب ایک عورت پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔البتہ سب رس کے مقابلے میں اسے یہ تفوق ضرور حاصل ہے کہ اس میں مجرد صفات کو انسانوں کی جگہ نہیں دی گئی۔البتہ اس کے کردار باقاعدہ گوشت پوست کے انسان ہیں۔

داستان امیر حمزہ کا سالِ تالیف ۱۸۰۱ء ہے۔اس قصے میں اکثر اوقات رجال داستان میں فوق العادت اور خلافِ عقل باتیں بھی نظر آتی ہیں۔ساری داستان میں اہم کردار عمرو عیار کا ہے۔یہی قصہ کی جان اور مرکز ہے۔اس کے کردار میں نادر گلکاریاں ہیں۔اس قصہ میں کرداروں کی کثرت ہے۔قصہ امیر حمزہ میں عرب و عجم کی مشاہیر ہستیوں کی آمیزش ہے۔ایک طرف امیر حمزہ، عمرو عیار اور مقبل کی سیرتیں عربی ہیں۔ دوسری طرف بزرچ مہر، بختک اور نوشیرواں وغیرہ خالص ایرانی ہیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم ،داستان امیر حمزہ کے کرداروں کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر منتج ہوتے ہیں کہ خلیل علی خان اشک نے:

> ''کرداروں کو قصہ میں جگہ دیتے وقت یہ بات پیشِ نظر نہیں رکھی کہ ان کی شخصیت اور ان کی رفتار و گفتار میں مطابقت و مناسبت اور ہم آہنگی نہ ہو تو کردار کا نقش بگڑ کر رہ جاتا ہے۔''۱۱

زریں نے نوطرز مرصع کو ۱۸۰۲ء میں سادہ زبان میں تحریر کیا۔ زریں اس قصے کو قبل ازیں شگفتہ فارسی عبارت میں ترتیب دے چکے تھے۔ زریں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ اسی سبب سے وہ کسی واقعے یا کردار کی واضح تصویر پیش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ زریں نے شہزادی کا جو کردار پیش کیا ہے۔ اس میں شہزادیوں کی سی تمکنت، وقار اور خودداری بالکل نہیں۔ اسے پاکیزگی وعفت اور عزتِ نفس کا مطلق پاس نہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے بجا کہا ہے ''زریں نے شہزادی کے کردار کو بالکل خاک میں ملا دیا ہے۔''

اس مضمون میں معین الرحمٰن باغ و بہار تک اردو کی نثری داستانوں میں کرداروں کی روایت کا مطالعہ مکمل کیا ہے۔ مضمون نگار اس جائزہ سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بہ اعتبار مجموعی باغ و بہار تک کی نثری داستانوں میں کوئی سیرت ایسی نہیں جسے کردار نگاری کے شہ کار نہیں تو کم از کم اچھا نمونہ کہا جائے۔

افسر صدیقی کا مضمون ''گلزار نسیم کی حکایت مرغ اسیر'' رسالہ ''نیا دور'' کراچی میں ۱۹۷۱ء میں چھپا۔ مضمون نگار نے ابتداء میں گلزار نسیم کی شہرت کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی جس شہرت کی حامل ہے۔ اسے تمام اہل فہم مانتے ہیں۔ حضرت شوق قدوائی نے منشی میکو لال رفعت کی فارسی مثنوی کو گلزار نسیم کا ماخذ قرار دیا۔ فرمان فتح پوری نے گلزار نسیم اور اس کے ماخذ کا قضیہ طویل مضمون میں ظاہر کیا۔ مثنوی گلزار نسیم کا ماخذ خیابان ریحان نہیں بلکہ ''باغ و بہار'' ہے۔ جسے منشی ریحان الدین نے ۱۲۱۱ھ میں تصنیف کیا۔

افسر صدیقی کے اس مضمون کا تعلق بھی جزوی طور پر گلزار نسیم کے ماخذ سے ہے۔ یعنی نسیم نے مرغ اسیر کی جو حکایت گلزار نسیم میں تحریر کی ہے۔ وہ بھی اصل نہیں بلکہ جلال جعفر فراہانی کی اس قسم کی داستان سے اخذ ہے۔ گلزار نسیم میں یہ اس طرح ہے۔

اک مرغ ہوا اسیر صیاد
دانا تھا وہ طائر چمن زاد

نسیم نے اس حکایت میں مثنوی کا انداز کلام قائم رکھا ہے۔ گو اس شعر میں ان کے قلم سے مرغ اور طائر دونوں لفظ خارج ہو گئے۔ شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ مرغ ہندوستانی اصطلاح میں خاص جانور کہلاتا ہے۔ اس لیے اس کی تشریح دوسرے مصرعے میں طائر کہ کر دی ہے۔ اگر ان کا جی چاہتا تو اس شعر کو اس طرح لکھ سکتے تھے۔

؎ اک طائر خوش نوا چمن زاد
ناگاہ ہوا اسیر صیاد

اگر صیاد کے لحاظ سے دانا نظم کرنا ضروری سمجھتے تو یوں کہا جا سکتا تھا۔

دانا اک طائر چمن زاد

نا گاہ ہوا اسیر صیاد

جلال جعفر فراہانی کی پوری نظم نقل کی گئی ہے۔ مضمون نگار نے نسیم اور جلالی جعفر کے ابیات کا تقابل کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نسیم نے جو بات ۱۶ اشعار میں کہی، جلال جعفر ۳۵ اشعار میں وہ بات کہہ سکے۔ نسیم نے اختصار اور رعایت لفظی کا لحاظ رکھا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جلال نے بذرگر (کسان) اور اس کے باغ کی تعریف کا اضافہ کیا ہے۔ اس مضمون میں مثنوی گلزار نسیم کی حکایت مرغ اسیر کا ماخذ جلال جعفر فراہانی کی نظم بتائی گئی ہے۔ مزید نسیم اور جلال جعفر کے کلام کا تقابل سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ جس سے نسیم کا اختصار واضح ہوتا ہے۔

محمد انصار اللہ کا مضمون ''قصہ مہر افروز و دلبر'' سہ ماہی رسالہ ''اردو ادب'' انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے شمارہ نمبر ۲؛ ۱۹۷۰ء میں چھپا۔ مضمون نگار نے زبان کی داخلی شہادتوں سے قصے کے زمانے کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ قصہ مہر افروز کا مرتب معترف ہے بعض اعتبار سے اس کی زبان فائز کی زبان سے مختلف ہے۔ اس کا سبب زمانی بھی اور مکانی بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس پر نگاہ کرنا ضروری ہے۔ عیسوی خان کی زبان میں مذہبیت کا اثر زیادہ ہے۔ اس نے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جو نہ فائز کے یہاں اور نہ فضلی کے ہاں ہیں۔ مثلاً سمیا، کٹاچھ اور تاراگن وغیرہ۔

زمانے کے تعین سے متعلق قصہ کی داخلی شہادتوں میں سے ایک یہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ تبلیغ اسلام کا وہ جذبہ جو دوسری داستانوں کا جز و لاینفک ہے۔ اس قصے سے قطعی غائب ہے۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ قصہ ایسے زمانے میں تحریر کیا گیا جب لال قلعہ دہلی سے روح عالمگیر طلسمات ملتے ہیں۔

قصہ مہر افروز و دلبر کا مطبوعہ متن اس کے واحد دریافت شدہ نسخے کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ اس لیے اس مخطوطے کے طرزِ تحریر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ تحریر کے سلسلے میں قابلِ ذکر امور یہ ہیں'' کاتب یائے معروف اور یائے مجہول میں امتیاز نہیں کرتا۔'' املا کی ایک اور خصوصیت مخطوطہ میں ہے۔ کہ وہ چلیے، دیکھیے وغیرہ افعال کو اکثر جگہ چلیہ، دیکھیہ یعنی ہائے مجہول کی جگہ ہائے مخفی سے لکھتا ہے۔

مضمون نگار کے نزدیک قصہ مہر افروز و دلبر اور قصہ جان عالم اور انجمن آرا میں اصولی اور فنی نقطہ نظر سے خاصی مماثلت ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دونوں کے مصنفین کے نظریات میں یگانگت ملتی ہے۔ مثال کے طور پر قصہ جان عالم کا مصنف نقل کرتا ہے۔ دنیا میں تین طرح کے دشمن ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو صریح اپنا عدو ہو، دوسرا دشمن کا دوست، تیسرا دوست کا دشمن یہ سب سے برا ہے۔ اس سے کنارہ اچھا ہے۔ یہی بات قصہ مہر افروز میں اس طرح کہی گئی ہے۔

''دنیا میں تین طرح کے دشمن ہوتے ہیں ایک تو اپناں دشمن ہے سوتو دشمن ہے ہی دوسرا اپنا دوست کا جو دشمن ہے سوبھی اپناں دشمن ہے۔ تیسر میں اپنے دشمن کا جو دوست ہے۔ سوبھی اپناں دشمن ہے تو چاہیے کہ دشمن یا دشمن کے دوست جیتا کہ سلوک زیادہ کریں.....ان کے سلوک اور دولت خواہی کی باتوں کوں مکر ہی جانیئے۔''۱۲

ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ مصنف کا تعلق اودھ کے علاقے سے ہے۔ قصے میں علامتی ناموں کے استعمال نے دہلی کی عمارتوں سے مماثلت پیدا کر دی ہے۔ مثلاً دلبر خورشید بانو سے کہتی ہے کہ مہتاب باغ میں چاندنی کی تیار کر۔ قصہ مہر افروز کی پوری فضا لال قلعہ دہلی کی جھلکیوں سے مملو ہے۔ اور مصنف قلعہ و دربار سے وابستہ تھا۔

اس مضمون میں محمد انصار اللہ نے قصہ مہر افروز دلبر کے زمانہ کے تعین کے تناظر میں اسلوب کے داخلی شواہد، قصہ کے متن، قصہ کی مماثلت اور قصہ کی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ اسلوب کے جائزہ میں املا کی خصوصیات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ بالآخر مضمون نگار نے قصہ مہر افروز ودلبر اور قصہ جان عالم وانجمن آرا میں اصولی وفنی نقطہ نظر سے مماثلت واضح کی ہے۔

شاہ حاتم کی بہاریہ مثنوی ''بزم عشرت'' از غلام حسین ذوالفقار رسالہ صحیفہ ۱۹۷۳ء میں چھپی۔ شیخ ظہور الدین المعروف بہ شاہ حاتم کی شخصیت اردو ادب کی تاریخ میں گوناگوں خصوصیات کے سبب قابلِ ذکر ہے انھوں نے غزل کے علاوہ نظم کی مختلف اصناف کی تخلیق میں بھی حصہ لیا۔ اس دور میں بعض نظمیں محمد شاہ کی فرمائش پر لکھی گئیں۔ اسی سلسلے کی نظموں میں شاہ حاتم کی ایک بہاریہ مثنوی بزم عشرت ۱۱۴۷ھ میں لکھی گئی۔ حاتم کی یہ مثنوی شعری محاسن کے اعتبار سے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ محمد شاہی عہد کی تہذیب وثقافت کی عکاس بھی ہے۔ بزم عشرت میں عید اور ہولی پہلو بہ پہلو منائے گئے ہیں۔

اس مثنوی میں مختلف عنوانات کے تحت دل موہ لینے والے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ حمد وتوحید، تمہید، آغاز سخن کے بعد شاہ جہاں آباد کی توصیف، بادشاہ کی مدح، باغ کی تیاری، باغ میں گل وگلرنگ کا مناظرہ۔ مثنوی کا انداز ساقی نامے کا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین اس مثنوی کی اہمیت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

''بیانیہ نگاری اور منظر کشی کے اعتبار سے حاتم کی یہ مثنوی اردو شاعری کی تاریخ میں اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ شمالی ہند میں اردو مثنوی کا یہ دور اول تھا۔ اور حاتم نے اپنی اس مثنوی میں باغ کی تیاری اور گل و گلزار کی کیفیت دکھانے میں محاکات کا جو کمال دکھایا ہے۔ وہ میر حسن کی مثنویات کا نقش اول کہا جا سکتا ہے۔ راگ رنگ کے مناظر بھی خوب ہیں اور مقامی رنگ پوری طرح نمایاں ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں ہولی کا یہ منظر کتنا صحیح اور اس موقع کے عام مشاہدے کے مطابق ہے۔

گلال، ابرک سے سب بھر بھر کے جھولی
پُکارے یک بیک ہولی ہے ہولی

یہی حال نغمہ و آہنگ کی مجلس اور روشنی و آتش بازی کا ہے۔''۱۳

اس مثنوی کا متن پیش کیا گیا ہے۔مخطوطہ ۱۱۹۵ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو متن کی بنیاد بنایا گیا ہے۔کلیات قدیم کے اختلافات قدرے زیادہ ہیں۔کلیات قدیم کے لیے حاشیے میں نسخہ کراچی لکھا گیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ''قصہ گل بکاؤلی کے تاریخی مباحث و ماخذات پر ایک نظر'' رسالہ صحیفہ میں جولائی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔مضمون کے آغاز میں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ قصہ گل بکاؤلی کی اصل کیا ہے۔اردو کے بعض ادیبوں نے گلزار نسیم پر بحث کرتے ہوئے قصہ گل بکاؤلی کی اصلیت کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔مضمون نگار نے اس قصے کی تاریخی حیثیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔اس میں فرہنگ آصفیہ از سید احمد دہلوی، گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی از محمد یعقوب تحفہ خان بہادر اور تواریخ بگھیل کھنڈ از خان بہادر، کشمیری میگزین از محمد دین فوق اور تاریخ طلسم بکاؤلی مولفہ سید محمد اسمعیل ڈاسنوی شامل ہیں۔قصہ بکاؤلی کی تاریخی حقیقت کے ضمن میں بہت معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دو روایتیں ملتی ہیں۔ایک وہ جس کا آغاز یوں ہوتا ہے ''ملک دکھن میں کرنجوٹ نامی ایک راجا تھا۔اس کے دولڑکے تھے ایک شاستر جوگ دوسرے راج بھوج'' دوسری روایت کی ابتدائی سطور میں لکھا ہے۔اجودھیا کے سورج بنسی راجاؤں میں سے ایک راجا کرنجوٹ تھا۔اس کے دو بیٹے تھے۔ایک کا نام شاستر جوگ اور دوسرے کا میکل جوگ تھا۔ان مذکورہ بالا دونوں روایتوں کے سلسلے میں ماخذ کے طور پر چند کتابوں کے نام گنوائے گئے ہیں۔بلحاظ تقدیم و تاخیر ان ماخذوں کی ترتیب اور ان سے استفادہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

گلدستۂ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی محمد یعقوب ابن اکبر لکھنوی کی تصنیف ہے۔اس کا حوالہ کہیں گلدستۂ حیرت کے نام سے اور کہیں تواریخ بکاؤلی کے نام سے ملتا ہے۔دراصل یہ دونوں ایک ہی کتاب کے نام ہیں۔اس میں کل بائیس صفحات ہیں۔میر قدرت علی کا تیار کردہ نقشہ میں قلعہ بکاؤلی کا محل وقوع ظاہر کیا گیا ہے۔اس کا مطبوعہ نسخہ مملوکہ الماس یمانی صاحب ساکن ملیر کراچی مضمون نگار کے پاس ہے۔اس کے دیباچے میں موئف نے لکھا ہے۔

> ''قصہ بکاؤلی و تاج الملوک مرقوم و مشہور ہو چکا ہے۔مگر بجز افسانہ اصل حقیقت بکاؤلی اور اس کے مولد و مسکن سے کسی نے ایک حرف نگارش نہ فرمایا۔دریں ولا ایک رئیس قصبہ کاکوروی کے محمد عبدالسمیع صاحب خلف الصدق شیخ رحیم باسط صاحب اتفاقاً ملاقات کو آئے۔برسبیل ذکر مفصل کیفیت بکاؤلی کی زبان مبارک پر لائے اور نقشے مکانات و مقامات و باغ کے ساتھ شامل کر دیئے۔چونکہ رسالہ عجیب وقصہ

غریب تھا۔لہذا ہدیہ شائقین کرنے کا ارادہ ہوا۔ حکایت حیرت بخش ہے۔گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی اس قصے کا نام ہے۔''۱۴

مذکورہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ گلدستہ حیرت کا اصل مواد مولف کو محمد عبدالسمیع کاکوروی سے ملا ہے۔ یہی ان کی کتاب کی بنیاد بنا۔گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی قصہ گل بکاؤلی کے سلسلے کی پہلی تاریخی وتحقیقی تالیف ہے۔ اس کتاب کی روایات کا اہم پہلو تاریخ وتحقیق کی نظر سے وہ ہے۔جس میں سرجان ٹیمپل صاحب چیف ناگپور کی مہم کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مہم بعد کے تمام ماخذ میں دہرائی گئی اور محمد یعقوب ہی کی تالیف سے لی گئی۔

تواریخ بگھیل کھنڈ از خان بہادر رحمان علی خان قصہ گل بکاؤلی کے تاریخی ماخذ کے ضمن میں دوسری قدیم کتاب ہے۔تواریخ بگھیل کھنڈ تین حصوں میں ہے۔جس کا پہلا حصہ تحفہ خان بہادر کے نام سے ہے۔رحمان علی خان نے اپنی کتاب میں مولوی سید بدر علی تحصیل دار رام نگر کی سیر و سیاحت اور ذاتی مشاہدات و تجربات سے استفادہ کیا ہے۔اس اعتبار سے تواریخ بگھیل کھنڈ قصہ گل بکاؤلی کے سلسلے کی اہم کتاب ہے۔اس کے اندراجات ایک ایسے شخص کی کاوش کی فکر کا ثمر ہیں جو شروع سے آخر تک ریواں میں رہا۔

سید محمد اسمٰعیل نے اپنی تالیف تاریخ طلسم بکاؤلی مطبوعہ ۱۸۹۴ء کو بعض اضافوں کے ساتھ ''سیر بکاؤلی'' کے نام سے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔تفصیلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سید محمد اسمٰعیل نے تاریخ گل بکاؤلی میں گلدستہ حیرت مولفہ محمد یعقوب سے فائدہ اٹھایا ہے۔اپنی طرف سے بھی چند اضافے کیے۔داستان بنیادی طور پر وہی ہے جو گلدستہ حیرت میں بیان ہوئی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ''تواریخ بگھیل کھنڈ'' سے بھی استفادہ کیا ہے۔سیر بکاؤلی میں اہم بات یہ ہے کہ محمد اسمٰعیل نے اس میں بکاؤلی اور قلعہ بکاؤلی کے طلسمات کو قابلِ یقین ثابت کرنے کے لیے یونان و ہندوستان کے کافی طلسمی واقعات درج کیے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ مولفہ سید احمد دہلوی قصہ گل بکاؤلی کی تاریخی حیثیت کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہے۔اردو کی یہ مشہور لغت چار جلدوں میں ہے۔اس لغت کی جلد اول اور جلد چہارم میں جہاں بکاؤلی اور گل بکاؤلی کے معنی درج ہیں۔اس قصے کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔پہلی جلد مطبوعہ ۱۹۱۸ء میں بکاؤلی اور لکھا بیسوا کے بارے میں نقل ہے۔''راجہ میکل جوگ ریواں کی لڑکی کا نام نربدال تھا۔نربدا کی ماں نے پیار سے کہا یہ بکاؤلی ہے۔یعنی سفید بگلوں کی ٹکڑی آ رہی ہے۔'' سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ جلد دوم میں محمد یعقوب کی تالیف سے نہیں البتہ سید محمد اسمٰعیل کی تاریخ طلسم بکاؤلی سے فائدہ اٹھایا ہے۔اس لیے کہ اول اول اسی میں کرنجوٹ کے دوسرے بیٹے کا نام راج بھوج کے بجائے میکل جوگ بتایا گیا۔

اس مضمون میں قصہ گل بکاؤلی کے تاریخی مباحث و ماخذ پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔جس میں قدیم ماخذ گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی از محمد یعقوب ہے۔اسی سے باقی مؤلفین نے استفادہ حاصل کر کے مزید اضافہ کا رجحان

بڑھایا۔ یہ مضمون اپنی نوعیت کے لحاظ سے محققین و ناقدین اور مورخین کے لیے حوالے کا کام دے گا کیوں کہ اس میں قصہ گل بکاؤلی کے تشنہ پہلو کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ تنقید میں ادبی و تاریخی لحاظ سے اہم اضافہ ہے۔

اس مقالے میں (۱۵) مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مضامین کہنہ مشق ادیبوں کے فکر کی جولان گاہ ہیں اس وجہ سے نئے ادیبوں کی تربیت کا گہوارہ بھی ہیں۔ان مضامین میں ناقدین نے متعدد داستانوں پر تحقیق وتنقیدی تبصرے لکھے جنھیں رسائل نے چھاپ کر قارئین کو ان سے استفادے کا موقع دیا۔ان مضامین میں ناقدین،مورخین اور محققین نے ایسا معتبر اور باوثوق مواد فراہم کیا ہے جس سے مستقبل کے طلبہ کو داستان کی تفہیم میں مدد ملے گی۔ یہ مضامین اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے داستانوی تنقید میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔تنقید میں ان مضامین کی اہمیت ناقابل فراموش ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، ''گل بکاؤلی'' نقوش، دس سالہ نمبر ۶۷،۶۸ (جون ۱۹۵۸ء)،ص ۲۵۷

۲۔ راز یزدانی، ''داستان حمزہ'' نگار، (ستمبر ۱۹۵۹ء)،ص ۲۵

۳۔ راز یزدانی ''مطبوعہ طلسم ہوشربا'' نگار، (نومبر ۱۹۵۹ء)،ص ۸

۴۔ بذل حق محمود ''مقبول احمد کا قصہ ہیر ورانجھا'' صحیفہ، شمارہ (۱۸ جنوری ۱۹۶۲ء)،ص ۵۷

۵۔ ڈاکٹر محمد عقیل، ''مثنوی میں فوق فطری عناصر'' نقوش، شمارہ ۱۰۱، (نومبر ۱۹۶۴ء)،ص ۹۸

۶۔ فرمان فتح پوری، ''رزمیہ بحر اور سحر البیان'' نگار، (مارچ ۱۹۶۵ء)،ص ۵۱۔۵۰

۷۔ نسیم اختر پالوی، مثنوی قطب مشتری اور ملا وجہی کی کردار نگاری، نگار (جون ۱۹۶۵ء)،ص ۴۸

۸۔ امجد کندیانی، ''سب رس کا تنقیدی جائزہ'' اردو نامہ، شمارہ ۲۶، (۱۹۶۶ء)،ص ۳۸

۹۔ سید جاوید اختر، ''سب رس پر ایک نظر'' قومی زبان، جلد ۳۰ شمارہ ۶ جوز (۱۹۶۷ء)،ص ۲۸

۱۰۔ غیور عالم ''سب رس اور اسلوب بیان'' قومی زبان، جلد ۳۱ شمارہ ۶، (دسمبر ۱۹۶۷ء)،ص ۶۳۔۶۲

۱۱۔ سید معین الرحمٰن ''اردو کی نثری داستانوں میں کردار نگاری۔باغ و بہار تک'' فنون، شمارہ۔۱۰ (سالنامہ ۱۹۶۸ء)، ص ۱۱۳

۱۲۔ محمد انصار اللہ ''قصہ مہر افروز و دلبر'' اردو ادب، شمارہ ۲، (۱۹۷۰ء)،ص ۵۸

۱۳۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''شاہ حاتم کی بہاریہ مثنوی بزم عشرت'' صحیفہ، شمارہ ۶۴ (جولائی ۱۹۷۳ء)،ص ۱۳۔۱۲

۱۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''قصہ گل بکاؤلی کے تاریخی مباحث و ماخذ پر ایک نظر'' صحیفہ، شمارہ ۶۴ (۱۹۷۳ء) ص ۲۶۔۲۵